۱۳

مسٹر کھوسلہ سیشن جج گورداسپور کا فیصلہ اور جماعت احمدیہ

ہم حضرت مسیح موعودؑ کی ہتک کے ازالہ کیلئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے کیلئے تیار ہیں

(فرمودہ ۱۷؍اپریل ۱۹۳۶ء)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

میں پہلے تو جماعت کو اس امر کی طرف توجہ دلانی چاہتا ہوں کہ شاید پھر کوئی ابتلاء آنے والا ہے کیونکہ میں نے آج رؤیا دیکھا ہے کہ میں ایک گھر میں ہوں جو قادیان کا ہی ہے وہاں بہت سے احمدی مرد اور عورتیں جمع ہیں۔ عورتیں ایک طرف ہیں غالباً برقعہ وغیرہ پہن کر بیٹھی ہیں یا اوٹ ہے میں نے اس طرف دیکھا نہیں لیکن ایک طرف مرد ہیں اور ایک طرف عورتیں۔ چوہدری مظفر الدین صاحب جو کچھ عرصہ پرائیویٹ سیکرٹری بھی رہے ہیں اور اب بنگال میں مبلغ ہو کر گئے ہیں وہ اور ایک اور آدمی گھبرا کر کھڑے ہوئے جلدی جلدی بلند آواز سے میری توجہ کو ایک طرف پھیرانا چاہتے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ وہ دیکھئے کیا ہے۔ وہ دیکھئے کیا ہے۔ وہاں ایک چوہیا دَوڑی جارہی ہے۔ لوگ اُسے مار رہے ہیں اور میری توجہ اس طرف ہے لیکن چوہدری صاحب اور ان کا ایک ساتھی مجھے دوسری طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں اور آوازیں دے رہے ہیں۔ ان کے توجہ دلانے پر میں نے اس طرف دیکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ ایک جگہ دیوار شق ہے اور ایک چوہیا وہاں سر کے بل

لٹکی ہوئی ہے اسے دکھا کر چوہدری مظفر الدین صاحب جلدی جلدی مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ حضور یہ طاعون سے مَری ہے یا کسی اور طرح سے۔ حضور یہ طاعون سے مری ہے یا کسی اور طرح سے۔ اسے دیکھ کر میں یہی سمجھتا ہوں کہ یہ طاعون سے ہی مری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری بڑی بیوی بھی وہیں ہیں میں ان سے کہتا ہوں کہ چلو گھر چلیں لیکن پھر خیال آتا ہے کہ اس گھر کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اسے طاعون سے محفوظ رکھوں گا اس لئے موجودہ جگہ سے جہاں طاعون کے آثار پیدا ہو چکے ہیں ہمارا اس گھر میں جانا وحی الٰہی کی بے حرمتی کا موجب تو نہ ہوگا اور میرے دل میں خیال گزرتا ہے کہ کیوں نہ سات دن کسی کھلے میدان میں باہر رہ کر پھر گھر جائیں۔ میں اسی خیال میں تھا کہ آنکھ کھل گئی۔ اور چوہدری صاحب جب مجھے وہ مری ہوئی چوہیا دکھا رہے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اور بھی بہت سے چوہے مرے پڑے ہیں۔ چوہے سے مراد منافق بھی ہوتا ہے اور طاعون بھی۔ پس اس خواب کا اشارہ کسی ایسے فتنہ کی طرف بھی ہوسکتا ہے جو گھبراہٹ کا موجب ہو یا منافقوں سے ہمارا مقابلہ آپڑے اور اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کر دے اور اس سے مراد طاعون بھی ہوسکتا ہے اور ممکن ہے اس سال طاعون زیادہ زور سے پھوٹے یا آئندہ زمانہ میں پھر اس کا شدت سے ظہور ہو۔ اسی سال ایک دشمن نے اعتراض کیا ہے کہ مرزا صاحب نے تو لکھا تھا کہ طاعون بند نہ ہوگی اب طاعون کہاں ہے۔ حالانکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جہاں یہ فرمایا ہے کہ بند نہ ہوگی وہاں بھی اس کے خاص معنی ہیں اور جہاں فرمایا ہے بند ہوگی وہاں بھی اس کے خاص معنی ہیں۔ دراصل اللہ تعالیٰ عذاب لانے کے پیش خیمہ کے طور پر ایسے اعتراضات کرایا کرتا ہے جیسے قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا [1] اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو انگیخت کی جاتی ہے کہ وہ اس کے عذاب کو بھڑکا دیں۔ پس میں جماعت کو توجہ دلاتا ہوں کہ دعائیں کریں کہ اگر کوئی ایسا فتنہ مقدر ہو تو اللہ تعالیٰ جماعت کو اس سے بچائے اور منافقوں کا وبال ان پر ہی پڑے اور اگر اس سے مراد طاعون ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس سے بھی ہمیں محفوظ رکھے اور جیسا نمایاں سلوک ہمارے ساتھ پہلے کرتا رہا ہے ویسا ہی اب بھی کرے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔

اس کے بعد میں ایک نہایت ضروری امر کی طرف جماعت کو بالعموم اور نیشنل لیگ اور

حکومت کو بالخصوص توجہ دلاتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ وقت کا صحیح اندازہ نہ ہونے کی وجہ سے میں ایسے وقت میں غسل کیلئے گیا کہ جمعہ کیلئے آنے میں دیر ہوگئی اور یہ مضمون کسی قدر طوالت چاہتا ہے مگر چونکہ اس کا جلد سے جلد بیان کر دینا ضروری ہے اور گرمی کا موسم شروع ہو جانے کی وجہ سے نماز کا وقت بھی لمبا ہو گیا ہے اس لئے مَیں اسے بیان کر دیتا ہوں۔ یہ امر مسٹر کھوسلہ کا فیصلہ ہے۔ ہمارے دوستوں کو معلوم ہے کہ مولوی عطاء اللہ صاحب کے خلاف حکومت نے مقدمہ چلایا تھا اور پہلے مجسٹریٹ کی طرف سے ان کو کچھ سزا بھی دی گئی تھی۔ ان کی طرف سے سیشن کورٹ میں اپیل کی گئی اور وہاں ان کی سزا صرف نام کے طور پر رہ گئی اور سیشن جج نے ایسا فیصلہ کیا جس سے ہماری جماعت کے دل سخت مجروح ہوئے، مجروح ہیں اور مجروح رہیں گے۔ اس کے خلاف ہماری طرف سے ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی جس پر جماعت کا قریباً پندرہ ہزار روپیہ خرچ ہو گیا۔ ہائیکورٹ کے جج نے اپنے فیصلہ میں قریباً ان تمام شکایات کو جو ہم نے پیش کی تھیں درست تسلیم کیا اور ان میں اصلاح کی لیکن بعض باتوں کے متعلق اس نے لکھا کہ چونکہ حکومت کی طرف سے سزا بڑھانے کی درخواست نہیں کی گئی اس لئے قانون مجھے اجازت نہیں دیتا کہ میں واقعات میں جاؤں اور میں مجبور ہوں کہ جس حد تک سختی یا سخت الفاظ کے استعمال کا سوال ہے یا ایسے امور کا سوال ہے جو عدالت کی کارروائی سے تعلق نہیں رکھتے صرف اسی حد تک اپنے فیصلہ کو محدود رکھوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ بعض واقعات جو ہماری انتہائی دل شکنی کا موجب ہیں بلکہ ہمارے مذہب پر حملہ ہیں وہ بغیر جواب کے رہ گئے اور جماعت ایسے حالات میں مبتلاء کر دی گئی کہ اس کیلئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ عدالت سے باہر ان کا فیصلہ کرے یا کرائے۔ نیشنل لیگ نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے اور مجھے معلوم ہؤا ہے کہ نیشنل لیگ کے بعض ممبر اس فیصلہ کے متعلق رائے زنی کر رہے ہیں ایک چھپا ہوا ٹریکٹ بھی مجھے ملا ہے اور اگرچہ اُسے پڑھنے کا موقع مجھے تا حال نہیں ملا لیکن جو اطلاعات مجھے ملی تھیں ان کی بناء پر نیز ٹائٹل کو دیکھ کر میں سمجھتا ہوں اس میں بھی یہی مضمون ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ نیشنل لیگ کے صدر اس بارہ میں حکومت سے گفت وشنید کر رہے ہیں۔ نیشنل لیگ کے قیام کی اجازت دیتے ہوئے جب جماعت سے چاروں طرف سے یہ آواز آ رہی تھی کہ ایک ایسی مجلس قائم کرنے کی اجازت دی جائے جو ان سیاسی امور

میں حصہ لے سکے جن میں جماعت احمدیہ حصہ نہیں لے سکتی۔ اس وقت منجملہ دیگر شرائط کے ایک شرط مَیں نے یہ بھی رکھی تھی کہ سلسلہ کے وقار اور اس کی روایات کو کسی صورت میں بھی پسِ پشت نہ ڈالا جائے، اسلامی تعلیم کے خلاف کوئی بات نہ کی جائے اور حکومت وقت کا کوئی قانون نہ توڑا جائے۔ میں نے تین ضروری شرائط رکھے تھے اور بتایا تھا کہ ان کے ماتحت لیگ اپنی ذمہ داری پر کام کرے ہاں مناسب مشورہ مجھ سے لے سکتی ہے اور یا جب میں خود مناسب سمجھوں دخل دے سکتا ہوں۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ ایسا موقع آیا ہے کہ مجھے خود دخل دینا چاہئے اور چونکہ اس کا تعلق لیگ کے ہزاروں ممبروں کے ساتھ بلکہ تمام جماعت کے ساتھ اور ایک حصہ کا تعلق حکومت کے ساتھ بھی ہے اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ خطبہ میں یہ امر بیان کردوں تا سب کو علم ہو جائے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جبکہ نیشنل لیگ کے صدر حکومت سے گفت وشنید کر رہے تھے تو ممبروں کو رائے زنی نہ کرنی چاہئے تھی۔ میرے نزدیک انسان کو ہمیشہ ایک خاص پالیسی کو مدّنظر رکھ کر کام کرنا چاہئے۔ میں مانتا ہوں کہ جو رائے زنی کی جارہی ہے وہ آئینی طریق کے اندر ہے مگر آئینی طریق بھی دو قِسم کے ہوتے ہیں۔ بعض ایسے کہ ایک وقت میں دونوں کو استعمال کیا جا سکتا ہے اور پھر بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو آگے پیچھے کرنا پڑتا ہے۔ اور جب ایک طرف اپنی براءت کی خواہش حکومت سے کی جارہی ہو تو دوسری طرف ایسے طریق اختیار کرنا جس سے اپنے طور پر براءت کرنے کا ارادہ ظاہر ہوتا ہو کچھ ایسا درست نہیں معلوم ہوتا۔ جب حکومت سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ سلسلہ کے نقصان کی تلافی کرے تو چاہئے تھا کہ پہلے اس سے جواب لے لیا جاتا اور پھر اگر ضرورت باقی رہتی تو خود کوئی قدم اٹھایا جاتا۔ دونوں کو ایک وقت میں جمع کر دینا میرے نزدیک مناسب نہیں تھا اور میری ذاتی رائے ہے کہ اس بارہ میں ممبروں نے غلطی کی ہے اور اگر لیگ نے ایسا کرنے کی اجازت دی ہے تو اس نے بھی عقلاً غلطی کی ہے۔ یا تو اسے حکومت کو مخاطب ہی نہ کرنا چاہئے تھا اور جب مخاطب کیا گیا تو پہلے اس سے فیصلہ کرانا چاہئے تھا اور یا پھر یہ کہہ دینا چاہئے کہ آپ تو فیصلہ کرتے نہیں اور خواہ مخواہ دیر لگاتے چلے جاتے ہیں اس لئے ہم اب خود سلسلہ کی عزت کو بچانے کی کوشش پر مجبور ہیں۔ میرے نزدیک ان تینوں صورتوں میں سے ایک نہ ایک کا اختیار کرنا ضروری تھا۔ یا تو حکومت کو مخاطب ہی نہ کیا جاتا یا اسے مخاطب کیا جاتا اور اس سے فیصلہ

کرایا جاتا۔ اور اگر وہ ایسا رویہ اختیار کرتی جس کے نتیجہ میں وقت ضائع ہوتا ہوتو اس سے کہہ دیا جاتا کہ آپ چونکہ دیر کرتے جاتے ہیں اس لئے ہم خود اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں آپ اب کچھ کریں یا نہ کریں۔

میری یہ بھی رائے ہے کہ نیشنل لیگ نے حکومت سے گفت وشنید کرنے میں بلاوجہ سُستی سے کام لیا ہے۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ ہماری جماعت کے ذمہ دار لوگ اس ذمہ داری کو پوری طرح نہیں سمجھتے جو اِن پر ہے۔ غالباً نو ماہ یا شاید سال کا عرصہ ہی ہو چکا ہے کہ میں نے صدر انجمن احمدیہ کو توجہ دلائی تھی کہ وہ حکومت سے تصفیہ کرے کہ کیا وہ تحقیقاتی کمیشن کے ذریعہ موجودہ شورش کے ایام کے واقعات میں ہماری، بعض افسروں کی اور احرار کی ذمہ داری کا فیصلہ کرنے کی طرف مائل ہے یا نہیں اور اگر وہ مائل نہ ہوتو پھر ایسے طریق اختیار کئے جائیں جو قانونی اور شرعی حدود کے اندر ہوں اور جن سے سلسلہ کے وقار کو قائم کیا جا سکے۔ لیکن ابھی وہ مرحلہ گورنمنٹ آف انڈیا تک پہنچا ہے حالانکہ اس حد تک زیادہ سے زیادہ چار مہینہ میں پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ پہلے تو کئی ہفتے چھوٹے چھوٹے ڈرافٹ کرنے میں لگ گئے، پھر کئی ماہ جواب کا انتظار کیا جاتا رہا حالانکہ چاہیئے یہ تھا کہ دو ہفتہ کے بعد ریمائنڈر دے دیا جاتا اور پھر دو ہفتہ کے بعد بھی اگر جواب نہ ملتا تو سمجھ لیا جاتا کہ جواب نہیں آئے گا اور دوسرا قدم اٹھایا جاتا۔ اب مرحلہ وزیر ہند کا ہے اور اس میں بھی بلا وجہ دیر ہو رہی ہے۔ یہ ایک سچائی ہے جسے زمیندار بھی جانتے ہیں کہ لوہا گرم ہی کوٹا جا سکتا ہے۔ جس کی صلاح لوہا کوٹنے کی ہو اور وہ اُس کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کرے اسے کوئی عقلمند نہیں کہہ سکتا یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کسی شکوہ پر لمبا عرصہ گزر جائے تو بالا افسر خیال کر لیتے ہیں کہ لوگوں کا غصہ دور ہو چکا ہے اب اس معاملہ میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ گویا ہمارے صدر انجمن کے کارکنوں نے بالا افسروں کو یہ کہنے کا موقع دے دیا ہے کہ اب گڑے مردے کیوں اکھاڑیں۔ جس وقت کوئی کسی کا گلا دبا رہا ہو اور ابھی دم باقی ہو تو ہر ایک اس کی مدد کو پہنچتا ہے کہ شاید بچ جائے مگر جب وہ مر چکا ہو تو لوگوں کو جلدی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ پس جس ذہنی حالت میں حکومت کے بالا افسر دخل دیا کرتے ہیں اسے خود ہمارے کارکنوں نے اپنی سستی سے دور کر دیا ہے اگر صدر انجمن ایسے وقت میں وائسرائے تک پہنچتی جبکہ واقعات ابھی تازہ ہی تھے تو دس فیصدی امکان

ضرور تھا کہ وہ دخل دے دیتے لیکن وہ ایسے وقت میں ان کے پاس پہنچے جبکہ حکامِ بالا درست سمجھتے ہیں کہ لوہا ٹھنڈا ہو چکا ہے اور جب معاملہ وزیرِ ہند تک پہنچے گا تو ان کیلئے بھی یہ کہنے کا موقعہ ہوگا کہ میں تو غیر معمولی حالات میں دخل دیا کرتا ہوں اب ان باتوں پر بہت عرصہ گزر چکا ہے اور میرے لئے دخل دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

نیشنل لیگ نے بھی اسی قسم کی سستی سے کام لیا ہے غالباً نومبر میں ہائی کورٹ میں فیصلہ ہوا تھا اسے زیادہ سے زیادہ دسمبر تک حکومت سے گفت وشنید ختم کر لینی چاہئے تھے اور پھر جنوری میں اپنی کارروائی شروع کر دینی چاہئے تھے۔ لیگ کی اسی سستی کا نتیجہ ہے کہ ایک افسر نے کہہ دیا کہ جب اتنی دیر تم لوگ خاموش رہے تو اب کیا ضرورت اس سوال کو اٹھانے کی ہے۔ گو یہ جواب غلط ہے اور دلائل سے اس کی غلطی کو ثابت کیا جاسکتا ہے مگر فطرتِ انسانی کی اس کمزوری کو کیا کِیا جائے کہ وہ ایسے موقع پر بہانے ڈھونڈتی ہے۔ کوئی شخص جب مشکل میں پھنس جاتا ہے اور وہ مذہبی آدمی نہ ہو تو وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس مشکل سے پیچھا چھڑائے اور حکومت کے افسروں کا قول اور فعل ایسا ہی ہے لیکن یہ کہنے کا موقعہ ان کو میرے نزدیک لیگ نے ہی دیا ہے۔ میرے نزدیک ہائی کورٹ کے فیصلہ کے پندرہ روز کے اندر اندر حکومت کو مخاطب کر لینا چاہئے تھا اور اگر پہلی چٹھی کا جواب نہ آتا تو اتنے ہی عرصہ کے بعد دوسری لکھی جاتی۔ یہ تو بے شک نہیں لکھنا چاہئے تھا کہ فلاں تاریخ تک ایسا کرو ورنہ ہم اس اس طرح کریں گے کیونکہ یہ ایک قسم کا چیلنج ہے اور حکومت کو چیلنج دینا عقل اور ادب کے خلاف ہے وہ اسے دھمکی سمجھتی ہے اور جس کے ہاتھ میں سونٹا ہو وہ دھمکی سے جلدی غصہ میں آجایا کرتا ہے اور جلدی ہتک محسوس کرنے لگ جاتا ہے۔

دنیا میں بہت جلد اپنی ہتک دو قسم کے لوگ محسوس کرنے لگتے ہیں یا تو طاقت ور جو سمجھتے ہیں ہم اپنا اعزاز کرا سکتے ہیں اور یا پھر بہت کمزور۔ پس حکومت کو یہ تو نہیں کہنا چاہئے تھا کہ فلاں تاریخ تک فیصلہ کر دو کیونکہ اس سے وہ غصّہ میں آکر کہہ دیتی کہ اچھا جاؤ جو کرنا ہو کر لو لیکن یہی بات لکھنے کا ایک اور طریق ضرور ہے اور جب مطالبہ معقول ہو تو بغیر دھمکی کے بھی یہ بات لکھی جاسکتی ہے۔ اس موقع پر ہماری پوزیشن یہ تھی کہ احراری اس فیصلہ کو شائع کر رہے تھے جس کے بعض حصوں کے متعلق ہائی کورٹ نے سخت ریمارکس دیئے ہیں بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ ایسے فیصلوں سے

جس منافرت کو دور کرنا مقصود ہوتا ہے وہ اور بھی بڑھ جاتی ہے اور کہ اس میں بعض باتیں واقعہ میں احمدیوں کو تکلیف دینے والی ہیں اور عدالتی دماغ کے ماتحت نہیں لکھی گئیں۔ اب اس فیصلہ کے ماتحت حکومت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسٹر کھوسلہ کے فیصلہ کی اشاعت سے جماعت احمدیہ کو ناجائز طور پر دکھ پہنچ رہا ہے اور بلا وجہ نقصان پہنچایا جارہا ہے ایسا دکھ اور ایسا نقصان جس کا جائز طور پر پہنچانا کسی کا حق نہیں اور ہماری پوزیشن ہائی کورٹ کے فیصلہ سے واضح تھی کہ اب لیگ والے اسے حکومت کے پیش کر کے کہہ سکتے تھے کہ پندرہ یا بیس روز ہوئے ہم آپ کو توجہ دلا چکے ہیں ہائیکورٹ کا فیصلہ آپ کے سامنے ہے ہم قانون شکنی نہیں کرنا چاہتے ہمارا دشمن قانون شکنی کر رہا ہے اور اس فیصلہ کو شائع کر رہا ہے جو ہائی کورٹ سے ردّ کیا جاچکا ہے اور آپ تاخیر کر کے ہم پر اس کے حملہ میں اس کی مدد کر رہے ہیں اور ہمارے ہاتھ روک کر ہمارے دکھ کو بڑھا رہے ہیں آپ کی طرف سے جتنی دیر ہوگی اتنا ہی آئین کی خلاف ورزی کرنے والے لوگ آئین کے پابند لوگوں کو بلا وجہ تکلیف پہنچاتے چلے جائیں گے اس لئے آپ جلد از جلد اس کا فیصلہ کریں ورنہ ۱۵ یا ۲۰ روز کے بعد ہم یہ سمجھ لیں گے کہ آپ اس بارہ میں کچھ نہیں کرنا چاہتے اور پھر خود اپنی حفاظت کیلئے کوئی مناسب قدم قانون کی حدود کے اندر اٹھائیں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض دفعہ صدر نیشنل لیگ نے ان معاملات میں مجھ سے مشورہ مانگا ہے مگر میں اس بارہ میں مشورہ دینے سے گریز کرتا رہا ہوں کیونکہ میں چاہتا تھا کہ خود اس کو غور کرنے اور سوچنے سمجھنے کا موقعہ ملے۔ چنانچہ ایک دفعہ میں نے انہیں ایک انگریزی کی ضرب المثل بھی سنائی تھی جس کا مطلب یہ ہے کہ بعض بڑی عمر کے آدمی بھی چاہتے ہیں کہ انہیں بچوں کی طرح چمچوں سے غذا دی جائے۔ کام کی قابلیت نفس پر بوجھ ڈالنے سے ہی پیدا ہوتی ہے اس لئے میں نے مشورہ دینا مناسب نہ سمجھا لیکن اب کہ کارروائی شروع ہو چکی ہے میں چاہتا ہوں کہ اپنا مشورہ بیان کر دوں۔ پس میری رائے یہ ہے کہ اگر اس قسم کی چٹھی کے بعد بھی جس کا میں نے ذکر کیا ہے حکومت توجہ نہ کرتی تو پھر لیگ مجاز تھی کہ وہ جو چاہتی کرتی اور اس کا ٹھیک وقت جنوری میں تھا اور اب اپریل میں اسے شروع کرنے کے معنے یہ ہیں گویا تین ماہ کا قیمتی وقت ضائع کر دیا گیا ہے اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ کارروائی شروع ہی بے موقعہ کی گئی ہے کیونکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے اب تک بھی تو حکومت نے کوئی جواب نہیں

دیا اور لیگ والوں نے یہ بھی نہیں کیا کہ قطعی طور پر حکومت سے کہہ دیا ہو کہ ہم اب خود جواب دینے لگے ہیں۔

ان حالات میں عقلاً یہ بات اچھی نہیں معلوم دیتی اور جو بات عقلاً بھلی معلوم نہ دے وہ طبائع پر اچھا اثر نہیں ڈالتی مثلاً اگر کوئی شخص کسی عدالت میں مقدمہ دائر کر کے اس کے فیصلہ سے قبل ہی اپیل دائر کر دے تو اسے کوئی بھی معقول نہیں کہے گا اس لئے میرے نزدیک یہی مناسب ہے کہ اب بھی حکومت پر زور دے کر اس سے جواب لیا جائے یا اسے کہہ دیا جائے کہ چونکہ حکومت بلا وجہ دیر کر رہی ہے ہم اس کے فیصلہ کا اب انتظار نہیں کر سکتے اور اس وقت تک اپنے طور پر کوئی طریق اختیار نہ کیا جائے۔

اس کے بعد میں وہ سوال لیتا ہوں جو حکومت اور پبلک کے دل میں بھی پیدا ہو رہا ہے اور جو میرے نزدیک واقعی ایسا ہے کہ اس کا جواب دیا جائے اور وہ سوال یہ ہے کہ ہائی کورٹ کے فیصلہ کے بعد بھی کیا اس کی ضرورت رہ جاتی ہے کہ حکومت کوئی مزید کارروائی کرے جبکہ ہمارے لئے یہ راستہ کھلا ہے کہ اس فیصلہ کو شائع کریں تو حکومت کی طرف سے کسی کارروائی کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سوال بظاہر نظر معقول ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ہائی کورٹ کے فیصلہ کی موجودگی میں بھی ہم مسٹر کھوسلہ کے خلاف کوئی کارروائی کرنا چاہیں تو اس کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہئے اور ہمیں اپنی پوزیشن واضح کرنی چاہئے کہ اس کے بعد ہمارے لئے کیا مشکل باقی رہ جاتی ہے۔ اس سوال کا جواب میں آج کے خطبہ میں دینا چاہتا ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مزید کارروائی کی ضرورت ہے اور ہائی کورٹ کا فیصلہ ہمارے شکوہ، ہمارے دکھ اور ہمارے نقصان کو دور کرنے کیلئے کافی نہیں اور اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہائی کورٹ کے فیصلہ کے بعد بھی پہلا فیصلہ برابر شائع کیا جا رہا ہے اور حکومت اسے نہیں روکتی۔ جن لوگوں تک وہ فیصلہ پہنچتا ہے قدرتی طور پر ان کے دلوں میں کچھ خیالات پیدا ہوتے ہیں اور پھر ان کے ذریعہ اور لوگوں میں بھی پھیلتے ہیں پھر ہر شخص جس تک یہ فیصلہ پہنچتا ہے ضروری نہیں کہ ہائی کورٹ کا فیصلہ بھی اُسے مل سکے۔ اب حکومت بتائے کہ اس حالت کا علاج ہمارے پاس کیا ہے۔ اگر حکومت اُسے ہائی کورٹ کے فیصلہ کے معاً بعد ضبط کر لیتی تو ہم کہتے کہ آئندہ نقصان کا تو انسداد ہو گیا اور گزشتہ پر اس حصہ کے متعلق ہم صبر

کر لیتے ۔مگر جب وہ فیصلہ برابر شائع ہو رہا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ہائی کورٹ کے فیصلہ کو غلط رنگ میں احراراخباروں میں شائع کرتے ہیں اور حکومت اس پر کوئی نوٹس نہیں لیتی ۔ ہائیکورٹ کے جج نے لکھا ہے کہ میں واقعات میں نہیں جاسکتا کیونکہ حکومت نے سزا بڑھانے کی درخواست نہیں کی اور میں نے صرف یہ دیکھنا ہے کہ عدالت نے اپنے رستہ سے ہٹ کر اور بے تعلق باتیں فیصلہ میں لکھ کر جماعت احمدیہ کی دل شکنی تو نہیں کی اور اسی اصل کے مطابق اس نے لکھا ہے کہ مجھے اس سے بحث نہیں ۔یعنی میں قانوناً اس بحث میں نہیں پڑ سکتا کہ مرزا صاحب شراب پیتے تھے یا نہیں مگر یہ بات ضرور ہے کہ عدالت کو ایسے الفاظ لکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی ۔ مجھے چونکہ قانون اجازت نہیں دیتا کہ واقعات کی بحث میں پڑوں اس لئے میں اس بات کی صحت یا عدمِ صحت کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن احراری اخبار لکھتے ہیں کہ ہائی کورٹ کے جج نے تسلیم کرلیا ہے کہ مرزا صاحب شراب پیتے تھے ۔ ہاں یہ لکھا ہے کہ اُسے ضرورت نہیں کہ وہ اس بحث میں پڑے ۔ ایک ہیڈ نگ یہی تھا کہ مرزا صاحب شراب پیتے تھے ۔اور بھی کئی مواقع پر اسے غلط رنگ میں پیش کیا گیا گویا پہلے ضرر کو اور بھی خطرناک کر دیا گیا ہے اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ حکومت کا وہ محکمہ جو چوہدری سر ظفر اللہ خان صاحب کے خلاف ہر اخبار کا ہر اقتباس حکومت تک پہنچاتا تھا وہ اس موقع پر کیوں سوتا رہا اور یہ اقتباس اس نے حکومت تک کیوں نہ پہنچائے اور اگر پہنچا دیئے تو حکومت کیوں خاموش رہی ۔کیا اُسے نظر نہ آتا تھا کہ جس چیز کا ازالہ ہائی کورٹ نے کرنا چاہا تھا اُسے اور پختہ کیا جارہا ہے اور ظاہر ہے کہ ان حالات کی موجودگی میں اگر جماعت احمدیہ اپنی زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت سمجھے تو اس کی ذمہ داری حکومت پر ہوگی ۔ دوسری بات یہ ہے کہ جج نے تسلیم کیا ہے کہ حکومت نے سزا کی زیادتی کی درخواست نہیں کی اس لئے میں واقعات میں نہیں پڑ سکتا ۔ ہوسکتا ہے کہ ایک جج واقعات سے غلط نتائج اخذ کرے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صحیح نتائج اخذ کرے اور ان کی صحت ، عدمِ صحت کے سوال کو ہائی کورٹ اسی وقت زیر بحث لاسکتا ہے جب زیادتی سزا کی درخواست ہو ۔ ورنہ قانوناً اس پر بحث نہیں ہوسکتی اور یہ درخواست پبلک کی طرف سے نہیں ہوا کرتی ۔ یا تو فریقین میں سے کسی فریق کی طرف سے ہوسکتی ہے اور یا پھر حکومت کی طرف سے اور اس مقدمہ میں تو دوسرا فریق ہی حکومت تھی اس لئے ہماری طرف سے تو یہ درخواست کسی صورت

میں بھی نہ ہوسکتی تھی ۔ واقعات پر بحث کرانا یا تو حکومت کے ہاتھ میں تھا یا مولوی عطاء اللہ صاحب کے ہاتھ میں ۔ ظاہر ہے کہ مولوی عطاء اللہ صاحب کو ایسی درخواست کرنے کی کیا ضرورت تھی اس لئے ایسا سوال اُٹھانے والی صرف حکومت ہی رہ جاتی تھی اور اس نے اٹھایا نہیں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جج نے لکھ دیا کہ واقعات کی صحت یا عدمِ صحت کے سوال میں مَیں نہیں جاسکتا اور اس وجہ سے مسٹر کھوسلہ کے فیصلہ کا ایک حصہ ایسا رہ گیا جو واقعات کے صحیح یا غلط ہونے سے تعلق رکھتا ہے اور اس حصہ میں سلسلہ احمدیہ اور اس کے مقدس بانی علیہ السلام پر حملے ہیں ۔

اب میں حکومت سے پوچھتا ہوں کہ وہ مجھے بتادے کہ ان کا ردّ جماعت کس طرح کرے اگر اس کے ردّ کی کوئی صورت ہمارے اختیار میں تھی تو حکومت ہمیں وہ قانون بتادے جس سے ہم ایسا کرسکتے تھے ۔ پھر وہ کہہ سکتی ہے کہ تمہارے لئے قانون نے یہ راستہ کھولا ہوا تھا مگر تم نے اس سے فائدہ نہیں اُٹھایا تو ہم کیا کرسکتے ہیں ۔ اس پر ہم اپنی غلطی کو تسلیم کرلیں گے لیکن جب صرف حکومت ہی اس سوال کو اٹھا سکتی تھی اور اس نے نہیں اٹھایا تو ذمہ داری یقیناً اس پر ہے اب وہ ہمیں بتائے کہ جو مشکل اس نے ہمارے لئے پیدا کردی ہے اس کا علاج ہمارے پاس کیا ہے؟ مجھے بتایا گیا ہے کہ ایک بالا افسر نے ایک احمدی سے کہا کہ ناظر امور عامہ نے حکومت کے لیگل ریممبرر (Legal Rememberer) سے کہا تھا کہ ہم سزا کی زیادتی نہیں چاہتے اس لئے ایسی درخواست نہ دیئے جانے کی ذمہ داری جماعت پر ہے ۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ ناظر امور عامہ نے ایسا کہا تھا یا نہیں اس کے متعلق میں نے اب تک ان سے دریافت نہیں کیا لیکن اگر یہ کہا بھی تھا تو بھی میں سمجھتا ہوں حکومت کا جواب درست نہیں ۔ سزا کی زیادتی نہ چاہنا اور سزا کی زیادتی کی درخواست دینے کی ضرورت نہ سمجھنا ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ اگر ناظر صاحب امور عامہ نے یہ کہا بھی ہو کہ ہم سزا کی زیادتی نہیں چاہتے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ان کا یہ مطلب تھا کہ فیصلہ میں بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام پر جو الزام لگائے گئے ہیں ان کو بھی ہم دور کرانا نہیں چاہتے اور اس بارہ میں آپ کی ہتک کے ازالہ کی خواہش نہیں رکھتے ۔ کوئی عقلمند یہ باور نہیں کرسکتا کہ خانصاحب نے ایسی بات کہی ہو بلکہ کسی احمدی بچہ نے بھی یہ بات کہی ہو ہم تو اس ہتک کو دور کرانے کیلئے اپنے خون کا آخری قطرہ بہادینے کیلئے تیار بیٹھے ہیں اور یہ خیال کرنا کہ ناظر صاحب امور عامہ نے یہ کہا

ہو گا کہ سزا میں زیادتی نہ ہو بانی سلسلہ احمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہتک اگر ہوتی ہے تو بیشک ہو بالکل خلاف عقل بات ہے۔ اگر ہم نے شرافت کی وجہ سے یہ کہا کہ ہم سزا میں زیادتی نہیں چاہتے تو کیا اس شرافت کا نقصان ہمیں پہنچنا چاہئے تھا۔ اگر ہم حکومت کو مشکلات سے بچانے کے لئے قربانی کرنے کو تیار تھے تو کیا اس کا یہی فرض تھا کہ ہماری مشکلات میں اضافہ کر دیتی اور ہمیں پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیتی۔ اور ان باتوں کا باقی رہنا تو ہمارے لئے پھانسی سے بھی زیادہ ہے اگر ہم نے کہا تھا کہ سزا میں اضافہ نہ ہو تو جماعت احمدیہ حکومت سے لڑتی نہیں رہے گی تو اس کا یہ مطلب کس طرح ہو گیا کہ ہم پر جو اعتراض کئے گئے ہیں ہم انہیں بھی دور کرانا نہیں چاہتے۔ حکومت کو چاہئے تھا کہ وہ درخواست دیتی کہ سزا بڑھائی جائے اور سرکاری وکیل کہہ دیتا کہ یہ درخواست رسمی طور پر اس لئے دی گئی ہے کہ واقعات پر بحث کی جائے ورنہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ سزا میں کوئی حقیقی اضافہ ہو یہ باتیں روز ہائی کورٹ میں ہوتی ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ اس طرح نگرانی کرنے میں ہائی کورٹ ضرور سزا میں اضافہ کر دے ایسے موقعہ پر جج مدعی کی خواہش کے مطابق واقعات کا فیصلہ کر دیتا اور سزا نہیں بڑھاتا۔ کیا حکومت کو اس بات کا علم نہیں تھا جس نے یہ قانون بنائے ہیں۔ پس اگر خانصاحب نے وہ بات کہی ہے تو یہ بتانے کیلئے جماعت احمدیہ حکومت کو کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتی اور مولوی عطاء اللہ صاحب سے بھی اسے کوئی بغض نہیں۔ یہ ہماری شرافت تھی جسے پھانسی کا پھندا بنا کر حکومت ہمارے گلے میں ڈالنا چاہتی ہے اور ہماری نیکیوں کا خمیازہ بھگتنے پر ہمیں مجبور کیا جارہا ہے حکومت کا فرض ہے کہ ہماری مشکلات کو سمجھے اس کے بغیر وہ کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتی۔

جماعت احمدیہ ہمیشہ امن پسند رہی ہے اور اب بھی اس نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہر حال میں امن پسند رہے گی جس رنگ میں جماعت کے مقدس بانی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور دوسرے بزرگوں پر حملے کئے جاتے ہیں جیسی گندی گالیاں دی جاتی ہیں کیا بالکل ویسی ہی باتوں پر دوسری قوموں نے خون نہیں کئے۔ ہم بزدل نہیں مگر خدا تعالیٰ نے ہمارے ہاتھ روکے ہوئے ہیں اگر دس بیس احمدی دس بیس احراریوں کو مار دیتے ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ حکومت فوراً توجہ نہ کرتی مگر ہم نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی امن پسندی کی تعلیم کو زندہ رکھا اور میں بار بار خطبات میں جماعت کو توجہ دلاتا رہا کہ کسی کے بہکاوے میں نہ آنا اور امن پسندی کا سبق بھول نہ جانا۔ حالانکہ یہ میرا فرض

تو نہ تھا۔ حکومت کو اپنی غلطیوں کا خمیازہ بھگتنا چاہیئے تھا۔ ہم بھی سب کچھ کر سکتے تھے مگر نہیں کیا۔ قادیان میں ہمیں گالیاں دی گئیں بلکہ مارا بھی گیا، میرے بھائی پر ایک فقیر کے لڑکے نے حملہ کیا اور احرار نے کرایا، بمبئی میں ایک احمدی بچے کی لاش کو دفن کرنے سے روک دیا گیا، بریلی میں اپنی خرید کردہ زمین پر نئی بنی ہوئی مسجد کو گرانے کی کوشش کی گئی، احرار سے تعلق رکھنے والے بعض لوگوں نے مسجد کے پاس ایک مکان کرایہ پر اس نیت سے لیا کہ اس کی چھت پر سے مسجد کی چھت پر جایا جاسکے اور اسے نقصان پہنچایا جاسکے اور صاف لفظوں میں احمدیہ مسجد کے گرانے کا فتویٰ بھی شائع کیا گیا جو ہمارے پاس موجود ہے۔ ابھی بھیرہ میں ایک احمدی کو مار مار کر اس کی کھوپڑی توڑ دی گئی پہلے تو ڈاکٹر اس کی زندگی سے مایوس تھے مگر اب اطلاع آئی ہے کہ زندگی کی کچھ امید ہوگئی ہے اور اس حملہ کی کوئی دنیوی وجہ نہیں تھی بلکہ محض مذہبی اختلاف اس کا موجب تھا۔ پھر چوہدری اسد اللہ خان صاحب پر ریل میں حملہ کیا گیا اللہ تعالیٰ نے انہیں بچالیا۔ سرہانہ دوسری طرف تھا اور خنجر لاتوں کے درمیان پھنس گیا ورنہ اگر سر اس کی طرف ہوتا تو خنجر سینہ میں اُتر جاتا۔ اس تمام اشتعال انگیزی کے باوجود کیا حکومت سمجھتی ہے کہ ہمارے سینوں میں دلوں کی بجائے پتھر ہیں ہمارے سینوں میں بھی ویسے ہی دل ہیں جیسے ہمارے دشمنوں کے سینوں میں مگر فرق صرف یہ ہے کہ ان کے دلوں میں حکومت کا خوف ہے اور ہمارے دلوں میں خدا کا۔ اگر ہمیں اللہ تعالیٰ کا ڈر نہ ہوتا تو ہم ہندوستان کو راس کماری سے لے کر ہمالیہ تک خون سے بھر سکتے تھے لیکن ہم نے نہ صرف یہ کہ اسے ناپسند کیا بلکہ اپنی جماعت کو یہ سبق یاد کراتے رہے کہ ایسے افعال ناجائز ہیں ہمارے اس نیک کام کے عوض میں حکومت نے ہمارے ساتھ کیا نیک سلوک کیا یہی کہ چونکہ انہوں نے ہمارے رستہ میں روکیں پیدا نہیں کیں اس لئے ان کے دل دکھنے دو۔ مگر اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارے ہاتھ تو خدا نے باندھ رکھے ہیں لیکن کاش وہ کل کے مؤرخوں کے ہاتھ اور قلم سے نکلنے والے الفاظ کو دیکھ سکتی۔ حکومتیں ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتیں کیا کوئی حکومت ہے جو ہمیشہ قائم رہی ہو؟ کیا روم کی حکومت اپنے عروج کے زمانہ میں یہ خیال کرسکتی تھی کہ وہ کبھی تباہ ہوجائے گی، قسطنطنیہ کی حکومت یہ سمجھ سکتی تھی کہ کوئی وقت آئے گا جب وہ مٹ جائے گی، کیا ایران کا کیانی خاندان کبھی یہ وہم کرسکتا تھا کہ ایک زمانہ میں ان کا نام لینے والا بھی کوئی نہ ہوگا، مصر کے فراعنہ کبھی اس کا تصور

کر سکتے تھے کہ ان کی جگہ دوسری حکومتیں آ جائیں گی، اہل مصر تو شاید انگلستان کا نام بھی نہ جانتے ہوں جس نے خدیو[۲] کے ذریعہ وہاں حکومت کرنی تھی۔ وہ فرانس کے نام سے بھی نا آشنا تھے۔ لیکن نپولین نے ان کا تمام ملک تہ و بالا کر دیا۔ پھر کیا انگریز خیال کر سکتے ہیں کہ ان کی حکومت ہمیشہ رہے گی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کل تک بھی قائم رہے یا سال تک رہے گی یا ایک صدی تک، بہر حال کوئی حکومت ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی ہے۔ اس کے انصاف کا نام قائم رہ جاتا ہے۔ رومی حکومت مٹ گئی مگر اس کا ایک ظلم اور ایک انصاف آج تک قائم ہے۔ رومی حکومت کا یہ ظلم ہمیشہ یاد رہے گا کہ اس نے حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کو بے گناہ صلیب پر لٹکا دیا اور پیلاطوس کا یہ انصاف بھی ہمیشہ یاد رہے گا کہ باوجودیکہ اسے دھمکی دی گئی کہ بادشاہ کے حضور اس کی رپورٹ کی جائے گی۔ اس نے پانی منگوا کر ہاتھ دھوئے اور کہہ دیا کہ میں مسیح کو بالکل بے گناہ سمجھتا ہوں۔ پیلاطوس کا یہ انصاف اور حکومتِ روم کا یہ ظلم دونوں باتیں نہیں مٹیں مگر حکومت روم مٹ چکی ہے۔ موجودہ انگریزی افسر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہمیشہ رہیں گے، ان کی نسلیں بھی ہمیشہ نہیں رہیں گی، حکومت بھی ہمیشہ نہیں رہے گی مگر ان کے افعال باقی رہ جائیں گے۔ آج اگر وہ انصاف کریں گے تو لوگ کہیں گے کہ انگریزی حکومت بڑی اچھی تھی اس نے اقلیت سے انصاف کیا اور اکثریت کی پرواہ نہ کی لیکن اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو آئندہ مؤرخ یہی لکھیں گے کہ وہ انصاف کے دعوے تو بہت کرتی تھی مگر جب وقت آیا تو افسوس کہ وہ فیل ہوگئی۔ کچھ مظلوم لوگ تھے جو انصاف کا مطالبہ کرتے تھے مگر حکومت نے انہیں انصاف نہ دیا۔ وہ دیکھتی رہی اور ان کے دلوں پر خنجر مارے گئے، وہ دیکھتی رہی اور ان کے سروں پر آرے چلائے گئے اور حکومت نے کوئی نوٹس نہ لیا اور صرف اس وجہ سے خاموش رہی کہ اکثریت رکھنے والے لوگ ناراض نہ ہو جائیں۔ صرف یہ چیزیں باقی رہ جائیں گی اور اس بات سے خود انگریز حکام ان کے وزراء اور پارلیمنٹ کے ممبر بھی انکار نہیں کر سکتے کہ انگریزی حکومت ہمیشہ نہیں رہے گی۔ پس ہم بے شک امن پسند ہیں قانون کا احترام کرتے ہیں، عدالتوں اور ججوں کی عزت قائم کرنے کے ہمیشہ قائل رہے ہیں۔ میرے خطبات دیکھ لئے جائیں میں ہمیشہ یہی نصیحت کرتا رہا ہوں اور اب بھی ہمارا یہی مسلک ہے لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ ہائی کورٹ کا فیصلہ بھی ہماری پوری طرح تسلی نہیں کرتا۔ اگر ہائیکورٹ میں واقعات زیرِ بحث

آ جاتے تو خواہ کچھ فیصلہ ہوتا ہم خاموش ہو جاتے اور خیال کر لیتے ہیں کہ آخری عدالت تک پہنچ گئے ہیں۔ اس صورت میں حالات کو ماننے کیلئے تیار تھے کہ آخر کہیں پہنچ کر تو خاموش ہونا ہی تھا۔ اور اب بھی جس حصہ کا فیصلہ ہائی کورٹ نے کیا ہے ہم عملاً اس کی عزت کر رہے ہیں حالانکہ اس سے بھی ہماری تسلی نہیں ہوئی لیکن جس حصہ کے زیر بحث لانے میں حکومت روک بن گئی ہے اس کے متعلق ہماری شکایت کے ازالہ کی کیا صورت ہے۔ پس گو ہم امن پسند ہیں قانون و عدالت کا احترام ضروری سمجھتے ہیں مگر ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ جس قربانی کا کسی سے مطالبہ کیا جاتا ہے اس کی ایک حد ہونی چاہیئے۔ جس شخص کا ایک پیسہ ضائع ہو رہا ہو وہ ہم سے امید کر سکتا ہے کہ ہم اپنا دھیلا ضائع کر کے اس کا پیسہ بچالیں اور یہ خیال کر لیں کہ وہ غریب آدمی ہے اس کا پیسہ ضائع نہ ہو بلکہ وہ امید کر سکتا ہے کہ ہم اپنا پیسہ ضائع کر کے بھی اس کا پیسہ بچالیں گے۔ حتّٰی کہ دو پیسہ، آنہ، دو آنہ بلکہ روپیہ تک ضائع کر کے اس کا پیسہ بچالیں کیونکہ اس غریب کا پیسہ بہت قیمتی ہے۔ مگر وہ اگر یہ مطالبہ کرے کہ فلاں شخص کے پاس دس کروڑ کی جائداد ہے وہ اسے برباد کر کے میرا پیسہ بچالے تو یہ دانشمندانہ مطالبہ نہیں کہلائے گا۔ پس ہم گو قربانی کے قائل ہیں۔ حکومت، عدالت اور قانون کے ادب اور احترام کے قائل ہیں مگر ہر عقلمند یہ تسلیم کرے گا کہ قربانی نسبتی ہوتی ہے۔ قربانی کے وقت ہمیشہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کون سی چیز بڑی ہے جس کیلئے قربانی کی ضرورت ہے یا خود وہ چیز جس کی قربانی کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ حکومت ہم سے فرمانبرداری کا مطالبہ کرتی ہے اور ہم اس مطالبہ کو جائز سمجھتے ہیں اور اس کی خاطر دوسروں سے ہمیشہ لڑتے رہے، گالیاں سنتے اور ماریں کھاتے رہے، حکومت کی فرمانبرداری کی وجہ سے ہمارے خلاف فتوے دیئے گئے مگر ہم پھر بھی یہی کہتے رہے ہیں اور اب بھی ہمارا یہی مسلک ہے کہ حکومتِ وقت کی فرمانبرداری کرنی چاہیئے۔ مگر جہاں حکومت ہزاروں باتوں میں ہم سے فرمانبرداری کی توقع رکھتی ہے وہاں کیا وہ یہ امید بھی کر سکتی ہے کہ وہ ہم سے کہے کہ نماز چھوڑ دو تو ہم اس کی فرمانبرداری کریں۔ اگر وہ ایسا مطالبہ کرے تو ہم فوراً اسے جواب دیں گے کہ آپ کا ملک آپ کو مبارک ہو ہم جاتے ہیں اور اگر جانے بھی نہ دے گی تو پھر ہمیں اس سے جہاد کی اجازت ہوگی اور ہم ظاہراً یا خفیہ طور پر جس طرح ممکن ہوگا اسے نقصان پہنچائیں گے اور یہ ایسی صورت ہے کہ حکومت بھی اس کی معقولیت کا انکار نہیں کر سکتی۔ کسی

وائسرائے، کسی گورنر اور کسی وزیر کے سامنے اُسے رکھ دو وہ تسلیم کرے گا کہ حکومت کو مذہب میں دخل نہیں دینا چاہیئے۔ سو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حکومت کی فرمانبرداری ضروری ہے مگر یہ نہیں کہ وہ مذہب میں دست اندازی کرے تو پھر بھی ہم اس کی فرمانبرداری کرتے جائیں۔ وہ کہے عیسائی ہو جاؤ تو ہم عیسائی ہو جائیں۔ اگر کوئی حکومت مسلمانوں کو عیسائی ہونے پر مجبور کرے تو یقیناً مسلمانوں کا حق ہوگا کہ وہ اس کا مقابلہ کریں خواہ زندہ رہیں یا مر جائیں مگر ایسے حکم کو کسی صورت میں نہ مانیں۔ اگر میرا یہ خیال غلط ہے تو کوئی بڑے سے بڑا افسر اس کے غلط ہونے کا اعلان کر دے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ کوئی ایسا اعلان نہیں کرے گا کیونکہ اس سے سب متفق ہیں۔ پس قربانی کے وقت ہمیشہ دیکھا جائے گا کہ کتنی قربانی چاہی جاتی ہے اور جس کیلئے چاہی جاتی ہے اس کی کیا قیمت ہے۔ اگر شخصی تذلیل کا سوال ہو اور کسی فیصلہ میں کسی شخص کو جھوٹا کہا گیا ہو تو اُسے گوارا کیا جا سکتا ہے اور اگر ہائی کورٹ کے فیصلہ کے بعد بھی اُسے جھوٹا ہی قرار دیا جائے تو جو لوگ جانتے ہیں کہ وہ سچا ہے وہ بھی اُسے یہی مشورہ دیں گے کہ اب خاموش ہو رہو۔ آخر جج بھی آدمی ہے اور کہیں جا کر یہ جھگڑا ختم ہونا ہی تھا تمہارے دوست جانتے ہیں کہ تم سچے ہو لیکن اگر تذلیل انسان کی نہیں بلکہ مذہب کی ہو اور مذہب بھی وہ جو لوگوں کو بلاتا ہے کہ آؤ اور مجھے قبول کرو۔ تو دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ انفرادی تذلیل پر باوجود اس شخص کے سچا ہونے کے ہم زور ڈال سکتے ہیں کہ ذلت برداشت کر لو لیکن مذہب کی تذلیل اگر عدالت کرتی ہے تو اس کی حالت جداگانہ ہے۔ پھر اگر وہ تذلیل اس مذہب کے ماننے والوں کے کسی فعل کی وجہ سے ہو تو کہہ سکتے ہیں کہ تمہارا اپنا قصور ہے۔ اگر ہم کوئی مقدمہ عدالت میں لے جاتے ہیں مگر اس مقدمہ میں تو ہم نہ مدعی ہیں نہ مدعا علیہ ہمیں اپنی بریت پیش کرنے کا بھی موقعہ نہ تھا۔ قانون ہمیں اس سے بالکل بے دخل رکھتا ہے مگر فیصلہ کا سارا زور ہمارے خلاف ہے۔ پس اس کی ذمہ داری بھی ہم پر نہیں بلکہ حکومت پر ہے یا مولوی عطاء اللہ صاحب پر۔ اور اس کے نتیجہ میں اگر کوئی ضرر کسی کو پہنچتا ہے تو ان دونوں میں سے ہی کسی کو پہنچنا چاہیئے ہم کیوں خواہ مخواہ اس کا شکار ہوں۔ اس فیصلہ میں ایسے امور زیر بحث لائے گئے ہیں کہ ہائی کورٹ نے صاف کہا ہے کہ ان کا زیر بحث لانا ناجائز تھا۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ایسا دیانتداری سے کیا گیا یا بددیانتی سے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کا اثر ہم پر کیوں

پڑے۔ اپیل کی اجازت دینے کے معنے ہی یہ ہیں کہ عدالتوں کا فیصلہ غلط بھی ہوسکتا ہے۔ اگر جج کیلئے غلطی کا امکان نہ ہوتا تو اپیل کے کوئی معنے ہی نہ تھے۔ لیکن عقلاً یا انصافاً بھی اگر کوئی عدالت ایسا فیصلہ کرے جو دانستہ یا نادانستہ طور پر مدعی اور مدعا علیہ کو چھوڑ کر ایک ایسی جماعت یا مذہب پر اثر انداز ہو جو تبلیغی ہو تو اسے کیا کرنا چاہئے۔

یہ سوال ہے جس کا جواب میں حکومت سے دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ حکومت جب ہمیں کہتی ہے کہ مت بولو تو اسے یہ بھی بتانا چاہئے کہ ہم کیا کریں۔ وہ بتادے کہ تمہارے لئے فلاں رستہ کھلا ہے یا یہی کہہ دے کہ کوئی راستہ کھلا نہیں مگر تم پھر بھی صبر کرو۔ میں اس سے پوچھتا ہوں کہ وہ ان دونوں باتوں میں سے ہمیں کیا کہتی ہے۔ دو ہی باتیں ہیں۔ یا تو رستہ بتادے یا یہ کہہ دے کہ خواہ تم کو کس قدر نقصان پہنچے خاموش رہو۔ جو بھی جواب وہ دینا چاہتی ہے دے تا کہ ہم اس پر غور کریں لیکن صبر کرنے کے متعلق اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکتا کیونکہ یہ سخت نامعقول بات ہے کہ کسی سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ خواہ تمہارے مذہب پر کس قدر سخت حملہ ہوا ہو، خواہ تمہاری تبلیغ رک گئی ہو تم خاموش رہو۔ پس اس کیلئے ایک ہی جواب ممکن ہے جو یہ ہے کہ وہ ہمیں بتائے کہ تمہارے لئے قانون نے فلاں رستہ کھلا چھوڑا ہے۔ اگر وہ کوئی ایسا رستہ بتائے جس کے ذریعہ سے خود جواب دیئے بغیر عدالت کے ذریعہ سے فیصلہ کرایا جاسکتا ہو۔ تو میں نیشنل لیگ کو مجبور کروں گا کہ اُسی رستہ کو اختیار کرے اور اگر کوئی ایسا رستہ نہیں تو حکومت بتادے کہ ہم کیا کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمیں صبر کرنے کا مشورہ حکومت نہیں دے سکتی۔ یہ فیصلہ ایک لاکھ کی تعداد میں شائع کیا جاچکا ہے۔ اردو انگریزی میں ہندستان، انگلستان اور بعض دوسرے غیر ممالک مثلاً افریقہ اور اسلامی ممالک میں بھی بکثرت تقسیم کیا گیا ممکن ہے اور بھی بعض ایسے علاقوں میں تقسیم کیا گیا ہو جن کے نام ہم کو معلوم نہیں۔ انگلستان کے متعلق تو خود احرار کے ایک اخبار میں لکھا تھا کہ جب مسٹر گابا وہاں گئے تو انہوں نے اس کی ایک کاپی وزیر ہند کو دی تھی۔ اب فرض کرو ہم کسی کے پاس تبلیغ کیلئے جاتے ہیں اور وہ آگے سے پوچھتا ہے کہ کیا تم مسلمان ہو اور اقرار کرنے کی صورت میں دریافت کرتا ہے کہ کیا شراب اسلام میں حلال ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ نہیں حرام ہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ تمہارے نبی اور مامور بھی تو شراب پیتے تھے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ یہ درست نہیں تو وہ آگے سے

کہہ دیتا ہے کہ کیوں نہیں مسٹر کھوسلہ نے ایسا لکھا ہے۔ عدالت کا فیصلہ ہے یہ کوئی احراریوں کا الزام تو نہیں اور بھی ایسے بیسیوں سوال پیدا ہو سکتے ہیں۔ اب ان سوالوں کے جواب میں ہمارے لئے دو ہی رستے کھلے ہیں۔ یا تو کہہ دیں کہ ہمارا سلسلہ واقعہ میں جھوٹا ہے اور ہم آپ کے ہاتھ پر توبہ ہی کرنے آئے ہیں اور یا یہ کہ یہ الزام جھوٹ ہے اور اس کا یہ ثبوت ہے۔ اب حکومت ہمیں بتا دے کہ ان دونوں باتوں میں سے وہ کونسا جواب ہم سے چاہتی ہے اور یا پھر کوئی تیسرا جواب بتا دے۔ جھگڑا تو وہاں ہوتا ہے جہاں کوئی ضد کرے مگر میں تو حکومت سے ہی سوال کرتا ہوں حکومت خود ہی ہمیں اس مصیبت سے بچنے کا ذریعہ بتا دے۔ آخر یہ تو ہم کہہ نہیں سکتے کہ چونکہ یہ امور عدالت کے فیصلہ میں آ گئے ہیں سلسلہ احمدیہ جھوٹا ہے۔ آخر ہم یہی کر سکتے ہیں کہ کتب و رسائل کے ذریعہ سے ان امور کی تردید کریں جو اس فیصلہ میں ہماری طرف منسوب کئے گئے ہیں لیکن اگر یہ طریق حکومت کے نزدیک معیوب ہے تو پھر وہ خود ہی کوئی علاج ہمیں بتائے۔ اگر وہ صبر کی تلقین کرتی ہے تو کس رنگ میں صبر چاہتی ہے۔ کیا ہم یہ کہیں کہ واقعات تو صحیح ہیں اور احمدیت جھوٹی ہے مگر باوجود اس کے ہم احمدیت کو نہیں چھوڑ سکتے۔ یا ہم اس رنگ میں صبر کریں کہ جب کوئی اس فیصلے کا حوالہ دے تو اسے کہہ دیں کہ ہم توبہ کرتے ہیں۔ اگر اس کے سوا بھی صبر کا کوئی طریق ہے تو وہ ہمیں بتا دیا جائے۔ جلدی نہیں اپنے مشیروں اور وکیلوں، ججوں سے پوچھ کر بتا دے کہ یہ طریق تمہارے لئے کھلا ہے۔ حکومت ہمارے اس سوال پر دیانتداری سے غور کرے کہ اگر کسی مذہب کی یہ پوزیشن ہو تو کیا وہ امید کر سکتی ہے کہ اس کی غلطی کی عزت رکھ لی جائے اور صبر کیا جائے۔ کیا وہ یہ کہہ سکتی ہے کہ آپ ہمارے دوست ہیں ہماری اس غلطی کو نباہنے کیلئے اپنا مذہب چھوڑ دو۔ موجودہ پوزیشن میں وہ اس بات کے سوا ہم سے کیا امید رکھ سکتی ہے لیکن اس بات سے زیادہ غیر معقول بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ بے شک بعض لوگ ایسا مطالبہ بھی کر لیا کرتے ہیں لیکن ہم حکومت سے ایسی امید نہیں کر سکتے۔ مجھے ایسے مطالبہ کے متعلق ایک واقعہ معلوم ہے اس واقعہ کا راوی بھی زندہ ہے اور جس کے متعلق ہے وہ بھی زندہ ہے اور دونوں اپنے اپنے محکموں کے چوٹی کے افسر ہیں اس لئے میں ان کے نام نہیں لیتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک کالج کے پرنسپل نے ایک شخص کی سفارش کی کہ اُسے پروفیسری کے عہدہ پر رکھ لیا جائے۔ جب وہ سفارش ایک بالا افسر کے پاس پہنچی تو اس نے کہا یہ

مناسب نہیں کہ آپ ایک ہی آدمی کا نام بھیجتے ہیں دو تین نام بھیجیں تا میرا اختیار بھی تو ثابت ہو کہ میں جس کو ان میں سے چاہوں رکھ سکتا ہوں گو میں کروں گا وہی جو آپ کہیں گے۔ اس پر پرنسپل نے بالا افسر کا اختیار ثابت کرنے کیلئے ایک اور شخص کا نام بھی لکھ دیا مگر ساتھ ہی لکھ دیا کہ یہ اس علم سے واقف نہیں۔ آپ نے چونکہ لکھا ہے کہ دوسرا نام چاہئے اور میرے پاس کوئی اور آدمی ہے نہیں اس لئے یہ نام بھیجتا ہوں۔ اب یہ دوسرا آدمی چونکہ اس بالا افسر کا ہم مذہب تھا اس نے حکم دیا کہ اسے رکھ لیا جائے۔ اس پر پرنسپل نے اس سے بھی ایک بالا افسر کے پاس شکایت کی کہ آپ نگرانِ اعلیٰ ہیں یہ کس قدر عجیب بات ہے۔ میں نے جس شخص کی سفارش کی تھی وہ انگلینڈ کا تعلیم یافتہ اور بطور نائب پروفیسر پہلے سے کام کرتا تھا۔ میرا اس سے وعدہ بھی تھا کہ جگہ نکلنے پر تم کو رکھا جائے گا مگر اس کی بجائے ایسے شخص کو مقرر کر دیا گیا جو اس علم سے بھی ناواقف ہے۔ اس پر اس بالا افسر نے جیسا کہ سرکاری افسروں کا قاعدہ ہے پرنسپل سے تو یہی کہا کہ یہ معاملہ میرے پاس لانے والا نہیں اعلیٰ افسر سے کہیں۔ اور اُدھر اس افسر سے کہا کہ یہ کیا بیوقوفی تم نے کی ہے خیر میں نے تمہاری عزت رکھ لی ہے اور تمہارے ہی پاس معاملہ کو بھیجا ہے خود ہی سلجھالو۔ اب پرنسپل تقرر کرنیوالے افسر کے پاس پہنچا کہ حضرت یہ کیا معاملہ ہے اور آپ نے یہ کیا کر دیا۔ اس پر اس نے پگڑی اتار کر اس کے پاؤں پر رکھ دی کہ میں پرانے فیشن کا آدمی ہوں مجھے ان باتوں کا کیا پتہ ہے اب میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اس پر پرنسپل بے بس ہو گیا اور اس نے کہا کہ اچھا جس طرح ہوگا میں کام چلا لوں گا۔ یہ بات ایک نہایت ہی ذمہ دار افسر نے جو ہزاروں روپیہ تنخواہ لے رہا ہے مجھ سے بیان کی تھی۔ مگر وہاں تو اس نے پگڑی رکھ کر اپنی عزت بچا لی مگر یہاں تو عزت بچانے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ پھر ہم نے خود یہ حالات پیدا نہیں کئے۔ اگر ہمارا اختیار ہوتا تو کبھی بھی ایسی حالت پیدا نہ ہونے دیتے جس سے حکومت کو مشکلات کا سامنا ہو مگر خود اس نے ایسے حالات پیدا کئے ہیں اس لئے اب نباہنا بھی اسی کا کام ہے۔ اس کی وضاحت کیلئے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ یہ حکومت عیسائی ہے اس لئے اس کے گھر کی مثال ہی دیتا ہوں۔ ہمارے نزدیک حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا وہی مقام ہے جو موسوی سلسلہ میں حضرت عیسیٰؑ کا ہے بلکہ ہمارے نزدیک تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا درجہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی بڑا ہے۔ وہ اگر اُسے

صحیح نہیں سمجھتے تو نہ سمجھیں۔ ہمارا عقیدہ ان پر اور ان کا ہم پر ہرگز حجت نہیں لیکن اس بات کو تو یورپین مصنفین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ احمدیوں کے نزدیک مرزا صاحب کا درجہ وہی ہے جو عیسائیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کا ہے اور جس طرح آج ہم پر مقدمے کئے جاتے ہیں اسی طرح حضرت عیسیٰؑ پر بھی ہوتے تھے۔ انجیل کو اٹھا کر دیکھ لو ان پر بھی حکومت سے بغاوت کا الزام لگایا جاتا تھا۔ ایک مقدمہ ان پر دائر ہوا اور حکومت نے ان کیلئے پھانسی کی سزا تجویز کی اور انہیں پھانسی پر لٹکا بھی دیا گیا۔ عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق وہ فوت ہو گئے لیکن ہمارے عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا لیا۔ اس مقدمہ کو آج انیس سو سال گزر چکے ہیں اور اس عرصہ میں اس فیصلہ کے ردّ میں سینکڑوں کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ اگر حکومت کے افسر مذہبی آدمی نہیں تو وہ برٹش میوزیم سے اس کے متعلق دریافت کریں کہ اس موضوع پر کتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور آج تک لکھی جا رہی ہیں۔ ابھی ایک کتاب مجھے ملی جو ایک شخص ریورنڈ اے۔ جے۔ واکر (Rev. A.J. Walker) نے لکھی ہے اور اس کا نام ہے Why Jesus was Crucified۔ اس نے واقعات اور گواہیوں پر بحث کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی براءت ثابت کرے۔ انگریز لوگ کہا کرتے ہیں کہ مشرقی مذہب کے دیوانے ہوتے ہیں۔ تو کیا یہ عجیب بات نہیں کہ مغرب کے مہذب لوگ جو نفس کو قابو میں رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ تو انیس سَو سال گزرنے کے بعد بھی اس مقدمہ کا ردّ لکھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور ہم مشرق کے مذہبی دیوانوں کو تازہ حملہ کا ردّ لکھنے سے بھی روکا جاتا ہے اور پھر ہم پر تو لوگ اعتراض کرتے ہیں اور ہمیں تبلیغ اور سلسلہ کی عزت کے بچاؤ کیلئے جواب کی ضرورت ہے۔ عیسائیوں کو تو اس کی ضرورت بھی کوئی نہیں۔ ان کی چونکہ حکومت ہے اور حکومت کو ہر کوئی سلام کرتا ہے اس لئے حضرت عیسیٰؑ کی بھی لوگ عام طور پر عزت کرتے ہیں۔ حتّٰی کہ گاندھی جی جنہوں نے یونہی رسول کریم ﷺ کی تعلیم پر دو چار لکد[۳] رسید کر دیئے تھے اور کہہ دیا تھا کہ اسلام تلوار کے استعمال کی تعلیم دے کر غلطی کا مرتکب ہوا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق انہوں نے بھی لکھ دیا کہ ان کی تعلیم محبت سے بھری ہوئی ہے۔ تو جس کا کھایئے اُسی کا گایئے کے مصداق حضرت عیسیٰؑ پر تو اعتراض بھی کوئی نہیں کرتا اس لئے ان کی تعلیم کی حفاظت کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ دل میں خواہ کچھ ہو ظاہراً طور پر ان کی عزت ہی کی جاتی ہے

کیونکہ ان کے ماننے والوں کی حکومت ہے مگر مشکلات تو ہمارے لئے ہیں۔ آج جس طرح یہ بات فیشن میں داخل سمجھی جاتی ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی توہین کی جائے۔ پس حضرت عیسیٰؑ جن کی عزت پہلے ہی محفوظ ہے اگر ان کے متعلق فیصلہ کا ردّ لکھنے کی انیس سَو چھتیس سال بعد بھی ضرورت ہے تو بانی سلسلہ احمدیہ کے متعلق ۱۹۳۵ء میں صادر شدہ فیصلہ کی تردید کی ۱۹۳۶ء میں ضرورت کیوں نہیں؟ حکومت بتائے کہ عیسائیوں کے بڑے بڑے پادری اور عالم فاضل آج تک بھی ایسی کتابیں کیوں لکھتے ہیں۔ کیا وہ پاگل ہوگئے ہیں۔ اس کی ضرورت یہ ہے کہ آج بھی کوئی نہ کوئی اعتراض کر ہی بیٹھتا ہے۔ پس یہ ایک ایسا سوال ہے کہ شاید انیس سو سال بعد بھی اس کے ردّ کی ضرورت باقی رہے۔ پس اس سوال کی اہمیت کو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لیکن باوجود اس کے حکومت کو مشکلات سے بچانے کیلئے گو میں نیشنل لیگ کے کام میں عام طور پر دخل نہیں دیا کرتا میں اس امر کیلئے تیار ہوں کہ اگر حکومت مجھے کوئی ایسا طریق بتا دے جس پر چل کر ہم اس فیصلہ کے ضرر کو دور کرسکیں تو میں تردید وتنقید کے سلسلہ کو حکماً روک دوں۔

میرا خیال ہے کہ اگر حکومت ٹھنڈے دل سے غور کرے اور جھوٹا وقار اس کے دامنگیر نہ ہو تو وہ اس سوال کو حل کرسکتی ہے اور میرے نزدیک اس کے دو طریق ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اس فیصلہ کو ضبط کرلے اس میں عدالت کی ہتک نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی اشاعت سے چونکہ فساد ہوتا ہے اس لئے ضبط کرلیا گیا اور حکومت کو جب خود کوئی ضرورت پیش آئے تو وہ ایسا کرلیتی ہے۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا اسمبلی میں ایک ممبر نے تقریر کی جو اسمبلی کے رسالہ میں شائع بھی ہوئی وہاں سے اُسے ایک اخبار نے نقل کردیا تو اُس سے ضمانت لے لی گئی اور جب اُس نے یہ ڈیفنس پیش کیا کہ حکومت نے خود اسے شائع کیا تھا تو اُسے جواب دیا گیا کہ حکومت کے رسالہ میں بے شک وہ شائع ہوئی لیکن تم کو ایسا کرنے کا اختیار نہ تھا۔ پس جب اپنے دل پر چوٹ لگنے پر حکومت نے یہ طریق اختیار کیا تو وہ دوسروں کیلئے بھی یہی تدبیر اختیار کرسکتی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر حکومت دوسروں کی چوٹوں کو بھی اپنی ہی سمجھے تو سب جھگڑے مٹ جائیں مشکل یہ ہے کہ اپنی چوٹ پر تو وہ حد سے زیادہ بھنّا اُٹھتی ہے مگر دوسرے پر ایسا موقعہ آنے پر کہتی ہے کہ جانے دو۔ اگر وہ اپنے دل میں ایسی تبدیلی کرے کہ ہر چوٹ کو اپنے دل پر محسوس کرے تو ملک میں بالکل امن وامان ہو جائے۔

پس حکومت اس کا فیصلہ دو طرح کر سکتی ہے ایک تو اس فیصلہ کو ضبط کر لے اور دوسرے جماعت احمدیہ کو اجازت دے کہ اس کا جواب کتاب کی صورت میں لکھ دیا جائے جس میں واقعات کی صحیح صورت پر بحث کر کے جواب دیا جائے اور اس میں عدالت کی شخصیت پر بحث نہ ہو پھر جس جگہ بھی اعتراض ہوگا وہاں کے احمدی اس کتاب میں سے دیکھ کر جواب دے دیں گے۔ اس کے بعد میں نیشنل لیگ والوں کو حکم دے دوں گا کہ وہ آئندہ اس بارہ میں کچھ نہ کرے۔ یہ دو تجویزیں میں نے بہت غور سے سوچی ہیں اور ان پر راضی ہو جانے میں بھی میں نے بہت قربانی کی ہے اور حکومت اگر میری طرح قربانی نہیں بلکہ صرف انصاف کرنے کیلئے تیار ہو تو یہ قضیہ نامرضیہ جو حکومت اور ہمارے دونوں کیلئے مشکلات کا موجب ہوسکتا ہے مٹ جائے گا۔ لیکن اگر حکومت ان دونوں تجویزوں کو نہ مانے تو پھر وہ اپنی طرف سے کوئی تجویز بتادے میں اس پر غور کروں گا لیکن اس کا فرض ہے کہ وہ یا تو میری تجویز مان لے اور یا پھر اپنی طرف سے کوئی ایسی تجویز بتائے جس سے اس فیصلہ کا ضرور دور ہو سکے اور اگر اس کی تجویز معقول ہوئی تو میں اس کو ضرور مان لوں گا۔ لیکن اگر کوئی صورت نہ ہو اور حکومت نہ تو خود کوئی تجویز بتائے اور میری پیش کردہ تجویز کے متعلق بھی کہے کہ تم تو رعایا کے ایک فرد ہو تم ایسی تجویزیں پیش کرنے والے کون ہو تو پھر اس کا کوئی علاج میرے پاس نہیں اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہے۔ میرا صرف یہ کام تھا کہ ایک اچھے شہری کی حیثیت سے امن کی بہتر صورت پیش کر دوں اور ساتھ یہ بھی کہہ دوں کہ اگر حکومت کوئی اور تجویز بتادے تو میں اپنی بات چھوڑ دوں گا لیکن اگر حکومت دونوں میں سے کوئی بات بھی نہ کرے تو پھر میں یہی کہوں گا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیّت ہی ایسی ہے اور ملک کا امن برباد ہونے والا ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے فساد مقدر ہو تو ادھر رعایا میں سے بعض لوگوں کے دماغ میں نقص پیدا ہو جاتا ہے اور ادھر حکومت اپنے رویہ کو بدلنے کیلئے تیار نہیں ہوتی اس لئے صرف یہی تدبیر باقی رہ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور جھکیں اور کہیں کہ ہم تو امن چاہتے ہیں مگر جن رستوں کو کھولنا ہمارے اختیار میں نہیں، انہیں تُو خود ہی کھول دے اور ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم سلسلہ کی روایات کو بھی قائم رکھ سکیں، قانون کا احترام بھی نہ چھوڑیں اور اس خدا کے پیارے کی عزت بھی قائم کرسکیں جس کی عزت قائم کرنے کیلئے ہم میں سے ہر ایک اپنی اور اپنے تمام

خاندان کی عزت قربان کر دینا سب سے بڑی عزت سمجھتا ہے۔

(الفضل ۲۴؍اپریل ۱۹۳۶ء)

۱؎ بنی اسرائیل: ۱۷

۲؎ خدیو: بادشاہ۔انیسویں صدی میں مصر کے بادشاہوں کا لقب

۳؎ لکد: لات۔ٹھوکر۔دولتّی